بشیر الدین احمد دہلوی

کسی دانشور کا قول ہے کہ ہر شخص اپنی پشت پر تاریخ کا ایک پشتارہ لادے پھر رہا ہے۔ ان بے لکھی انگنت تاریخوں میں کیسے کیسے عجیب وغریب واقعات ہوں گے؟ اللہ ہی جانے اور جب کیفیت یہ، کہ ؎

ایک ذرے کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرت سے حیراں ہو جائے

تو پھر

کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ

ایں دعائے عقل و دانش ہمارے علم کی بھلا کیا بساط ہے؟ اسے سمندر کا ایک قطرہ تصور کرنا بھی مبالغہ ہی ہوگا۔ خصوصاً جبکہ ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
نمائش سراب کی سی ہے

ابھی تو اپنے وجود ہی کے بارے میں ہمیں یقین نہیں ہے اور عالم شہود کی ہم طرح طرح سے تاویلیں کر رہے ہیں ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

خیر، یہ مابعد الطبعیاتی بحثیں ہیں جن میں پڑنے کا یہ موقع نہیں۔ مجھے یہاں بہت اختصار کے ساتھ یہ بتانا ہے کہ مولوی بشیر الدین دہلوی مرحوم کون تھے اور کیا تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے احسن القصص کا خلاصہ یوں کیا گیا ہے کہ مردے بود، پسرے داشت، گم شد، بازیافت، یعنی ایک صاحب تھے، ان کا ایک بیٹا تھا، وہ کھو گیا، پھر مل گیا۔ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے قصے کو مختصر کرنے پر اگر میں آؤں تو یہ کہہ کر ختم کر سکتا ہوں کہ "میرے والد تھے" مگر اتنا جمال

بھی کس کام کا کہ بات کچھ پلے ہی نہ پڑے؟ اس لیے مجھے کچھ نہ کچھ تفصیل سے کہنا ہی پڑے گا۔ لطف تو جب تھا کہ آپ مرحوم ہی سے ان کی سرگزشت حیات سنتے، مگر افسوس کہ مرنے والے کہانیاں نہیں سناتے۔ اس لیے یہ سعادت پسماندگان کے حصے میں آتی ہے۔ خصوصاً اولاد کے حصے میں۔ لہٰذا بمصداق

اگر پدر نتواند پسر تمام کند　　عرض کرتا ہوں سنیے

اللہ بخشے میرے والد مرحوم ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ وہی ڈپٹی نذیر احمد جنہوں نے مراۃ العروس، توبۃ النصوح اور ابن الوقت لکھی اور کلام مجید کا ترجمہ دلی کی ٹکسالی زبان میں کیا۔ دادا ا ہوش سنبھلاتے ہی بجنور سے دلی بغرض تعلیم آ گئے تھے۔ اس زمانے میں یونیورسٹیاں، کالج اور سکول نہیں تھے۔ امیروں کے بچوں کو پڑھانے میاں جی گھروں پر آتے تھے، اوسط طبقے کے شرفا اپنے بچوں کو کسی نامی گرامی عالم کے مکتب یا رسے میں بٹھا دیتے تھے اور غریب غربا کے بچے مسجدوں میں ملاؤں کے حوالے کیے جاتے تھے۔ غریب کا بچہ ننھا نذیر احمد پنجابی کٹرے کی مسجد میں داخل کر دیا گیا۔ مسجد کا ملا بڑا ظالم و جابر آدمی تھا۔ جب اس کا ناریل چٹختا تو بچوں کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ یہ مسجد طالب علموں کے لیے اقامت خانے کا کام بھی دیتی تھی مگر اقامت خانوں کی آسائشوں سے محروم تھی۔ دن بھر اس میں مار مار کر پڑھایا جاتا، جب کھانے کا وقت ہو تو طالب علموں سے کہا جاتا کہ جاؤ محلے میں سے روٹی مانگ لاؤ۔ محلے کے گھروں سے روٹی بندھی ہوئی تھی۔ بچے گھروں میں جاتے اور اپنی اپنی قسمت کا آذوقہ لے آتے۔ نذیر احمد کو جس گھر سے روٹی ملتی تھی وہ ایک جید عالم مولوی عبدالقادر کا گھر تھا۔ مفت روٹی کون کھلاتا ہے؟ نذیر احمد جب روٹی لینے جاتے تو انہیں بازار کا کوڑی پھیرا کرایا جاتا۔ سودا سلف لا دیا تو مولوی صاحب کی بچی کو بہلانا پڑتا۔ وہ کولہا توڑ چکتی تو مسالہ پیسنا پڑتا۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ مسالہ موٹا رہ　تو لڑکی بٹا چھین کر ان کے ہاتھ کچل دیتی اور یہ "سی" کر کے رہ جاتے۔ روزی رزق کا معاملہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ مسجد میں طالب علموں کے لیے نہ تو کمرے تھے اور نہ بستر۔ یونہی صحنچیوں اور آنگن میں پڑ رہتے۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں نذیر احمد ایک ٹاٹ کی صف میں لپٹ جاتے۔ صبح جب ملا جی اذان دینے اٹھتے تو ایک لات رسید کرتے اور نذیر احمد لڑھکتے چلے جاتے اور صف بھی کھل کر بچھ جاتی۔ علم کے شوق میں انہوں نے یہ ساری مصیبتیں جھیلیں۔ کڑوے تیل کے چراغ کی روشنی میں رات رات بھر پڑھا۔ جب چراغ میں تیل بھی میسر نہ ہوتا تو سڑک کے کنارے کسی لالٹین کے نیچے کھڑے ہو کر پڑھتے۔ مسجد میں نصاب پورا کرنے کے بعد حسن اتفاق سے دلی کالج میں داخلہ مل گیا۔ یہاں محمد حسین آزاد اور منشی ذکاء اللہ کا سا

آگے چل کر یہ تینوں ہم جماعت شمس العلماء بنے۔ جب تک جیتے رہے ان تینوں بزرگوں میں محبت اور دوستی کا سلسلہ قائم رہا۔

ہاں تو حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مولوی عبدالقادر صاحب کو اپنی صاحبزادی کے لیے رشتے کی تلاش ہوئی تو ان کی نظر انتخاب نذیرا پر پڑی۔ اگلے وقتوں میں ہڈی بوٹی دیکھی جاتی تھی، نذیر احمد کی ناداری ہی میں انہوں نے اپنی لڑکی کو بیاہ دیا۔ مالدار آدمی تھے، شاید یہ سوچا ہو کہ لڑکا ذہین اور محنتی ہے، گھر داماد رکھ لیں گے مگر غیرت دار نذیر احمد نے اسے گوارا نہیں کیا کہ سسرال کے ٹکڑوں پر پڑ جائیں۔ دلی والوں کی ایک مثل ہے۔ ''ساس گھر جنوائی کتا بہن گھر بھائی کتا'' بھلا نذیر احمد نے جو دلی کی زبان کے دیوانے تھے اس مثل کو کیسے نہ سنا ہوگا۔ علاحدہ ایک کوٹھری کرایہ پر لے کر رہے اور اپنی کمائی کی روکھی سوکھی پر قناعت کرتے رہے۔ میں نے اپنے خاندان کی بڑی بوڑھیوں سے سنا ہے کہ اس وقت ان کے گھر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی جوتی تھی جسے کبھی دادا ابا ہانگا لیتے اور کبھی دادی اماں۔ مجھے تعجب دادی اماں پر ہوتا ہے کہ وہ ایک رئیس آدمی کی لاڈوں پلی بیٹی تھیں۔ انہوں نے اس مفلسی اور تنگدستی کو خندہ پیشانی سے کیسے انگیز لیا؟ کوئی اور سوال کی ہوتی تو کبھی کی دھتا بتا چکی ہوتی۔ مگر نہیں، شرفاء کا یہی دستور تھا کہ ماں باپ نے جس کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا اسی کو اپنا مجازی خدا مان لیا۔ مرنا بھرنا ان کا اصول تھا۔ جس گھر میں لڑکی کا ڈولا گیا اس گھر سے پھر اس کی کھاٹ ہی نکلتی تھی۔

دلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نذیر احمد کچھ دنوں تک بیکار رہے۔ انہیں بڑا ایک دن پرنسپل سے جا کر بھڑ گئے۔ پرنسپل نے پوچھا۔ ''آج کل کیا کر رہے ہو؟'' بولے۔ ''جھک مار رہا ہوں۔ اپلوں کی ٹال کرنے کا ارادہ ہے۔ اس پر دلی کالج کی سند لگاؤں گا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے دلی کالج میں تعلیم پانے کا کیا حشر ہوتا ہے۔'' قصہ کوتاہ انہیں پہلے مدرسی اور اس کے بعد سکول انسپکٹری مل گئی۔ یہی زمانہ تھا کہ ان کے ہاں اولاد ہونی شروع ہوئی اور خدا کے فضل سے ایسی بھاگوان اولاد ہوئی کہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے چلے گئے۔ ڈپٹی کلکٹر بنے اور ڈپٹی صاحب کہلائے۔ ڈپٹی ان کے نام کا جزو ہی ہو گیا اور یہ سابقہ ان کے ساتھ ایسا چپٹا کہ حیدر آباد دکن میں رکن صدارت عظمیٰ ہو جانے کے باوجود ''ڈپٹی'' ہی کہلائے، نذیر احمد کو کوئی جانتا ہو یا نہ ہو ڈپٹی صاحب کو سب جانتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کی کتابیں، ڈپٹی صاحب کا اصغری اکبری کا قصہ، ڈپٹی صاحب کا ترجمہ قرآن حدیہ کہ تقسیم ہند تک ہم لوگ ''ڈپٹی صاحب والے'' کہلاتے رہے۔

میرے والد، ہنگامہ 1857ء جسے عرف عام میں ''غدر'' کہا جاتا ہے، کے تین چار سال بعد پیدا ہوئے۔ اس وقت عسرت ڈپٹی صاحب کے گھر سے رخصت ہو چکی تھی اور روز افزوں فارغ البالی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے میرے والد خوش قسمت تھے کہ میرے جد امجد کی طرح انہیں مفلسی میں آنکھیں کھولنی نہیں پڑیں، بلکہ انگریزی محاورے کے مطابق ''منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔''
یوں تو ڈپٹی صاحب کے ہاں کئی بچے ہوئے مگر جیئے صرف تین ہی، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ابتدا میں ان کی تعلیم کا انتظام دادا ابا نے خود کیا تھا۔ قرآن شریف دادی اماں نے اپنے سب بچوں کو خود پڑھایا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو دادا پڑھاتے تھے۔ اردو میں اس وقت بچوں کے لیے کتابیں ہی نہیں تھیں۔ دادا ابا نے یہ کیا کہ ایک کتاب لڑکیوں کے لیے اور ایک لڑکے کے لیے لکھ دی۔ اس وقت دادا ابا سر رشتہ تعلیمات میں تھے۔ اتفاق سے اس وقت کا انگریز ڈائریکٹر صوبے کا دورا کرتے کرتے دادا ابا سے ملنے گھر پر
اتفاق سے خورد سال میاں بشیر بھی کھیلتے کھیلتے ادھر آ نکلے۔ صاحب نے محبت سے بلایا اور پوچھا ''کیوں میاں، کیا پڑھتے ہو؟'' میاں بشیر نے کہا۔ ''اپنی کتاب پڑھتا ہوں۔ لا کر دکھاؤں؟'' صاحب نے کہا۔ ''ہاں لاؤ۔'' میاں بشیر دوڑ کر گئے اور گھر میں سے اپنی کتاب لے آئے۔ صاحب نے کتاب کو کہیں کہیں سے دیکھا۔ کتاب کہاں تھی، کتاب کا مسودہ تھا۔ بولے ''مولوی صاحب، یہ تو بہت اچھی کتاب ہے۔ آپ اسے چھپوا دیجیے۔'' میاں بشیر نے کہا۔ ''آپا کی کتاب بھی لا کر دکھاؤں'' صاحب نے کہا۔ ''ضرور دکھاؤ۔'' میاں بشیر لپک کر بڑی آپا کی کتاب بھی لے آئے۔ صاحب نے اسے بھی جستہ جستہ دیکھا اور حیران ہو کر بولے۔ ''مولوی صاحب آپ نے ایسی اچھی اچھی کتابیں لکھ کر گھر میں رکھ چھوڑی ہیں، انہیں فوراً چھپوا دیجیے تاکہ سب بچے ان سے فائدہ اٹھائیں۔'' چنانچہ یہ کتابیں دادا ابا نے چھپوا دیں۔ ایک مراۃ العروس تھی اور دوسری مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ چند پند تھی یا منتخب الحکایات۔ ان دونوں کتابوں پر صاحب نے سفارش کر کے سرکار سے انعام دلوا دیا۔ اس سے دادا ابا کو احساس ہوا کہ اچھی کتابیں لکھنے کی ان میں صلاحیت ہے۔
بچیوں کے لیے مراۃ العروس کا دوسرا حصہ بنات النعش لکھا اور لڑکوں کے لیے فارسی کی آسان گرامر ''صرف صغیر'' اور عربی کی گرامر ''مایغنیك فی الصرف''، لکھی۔ جب ڈپٹی صاحب کی یہ کتابیں شہرت کے پر لگا کر اڑیں اور گھر گھر پھیل گئیں تو ''ہل من مزید'' کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔ سرسید احمد خاں کی رفاقت کے بدولت ڈپٹی صاحب کو مسلم قوم اور مسلم معاشرے کی ابتر حالت کی طرف توجہ ہوئی اور خشک پند و وعظ کی بجائے انگریزی کی تقلید میں اصلاحی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ توبۃ النصوح، ابن

الوقت، فسانۂ مبتلا اور ایامی اسی دور کی یادگار ہیں۔

جب دادا ابا بسلسلہ ملازمت دلی سے باہر رہنے لگے تو میاں بشیر کو دلی کالج میں داخل کر دیا، گھر پر پڑھانے کے لیے بھی ایک استاد مقرر کر دیا۔ دادا ابا نے میاں بشیر کی طالب علمی میں جو خطوط انہیں لکھے پروفیسر شہباز مرحوم نے ان خطوں کو ''موعظہ حسنہ'' کے نام سے کچھ عرصے بعد شائع کر دیا۔ یہ خطوط نامہ و پیام کی حد سے نکل کر نصیحت فرجام کے دائرے میں آ جاتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے بڑی محبت اور بڑی دل سوزی سے بیٹے کو بار بار دل لگا کر پڑھنے کی تاکید کی ہے۔ خود بھی کئی طویل خطوں میں انگریزی اور عربی کے درس دیئے ہیں۔ بعض خطوں میں ناراض ہو کر میاں بشیر کو شفقت سے ڈانٹا بھی ہے۔ کہیں محبت پدری سے ان کا دل پسیج جاتا ہے اور بیٹے سے کہتے ہیں کہ ''تعلیم کے لیے جتنا روپیہ چاہو مجھ سے لے لو۔ اگر تمہیں کالج پیدل جانے میں زحمت ہوتی ہو تو بگھی رکھ لو، مگر پڑھنے سے غافل مت ہو۔'' میاں بشیر کند ذہن نہیں تھے، محنت سے بھی جی نہیں چراتے تھے مگر رئیس زادے تھے اور باپ کی طرح ان پر پیغمبری وقت نہیں پڑا تھا۔ ادب کے علاوہ ان کا جی کسی اور مضمون میں نہیں لگتا تھا۔ تاہم باپ کے خوف سے پڑھا اور دلی کالج سے فراغت حاصل کر لی۔ دادا ابا کا کہنا یہ تھا، اور ابا کا بھی کہ ''اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نگاہ'' دادا ابا نے مارنا تو کیسا کبھی میاں بشیر کو پھولوں کی چھڑی تک نہیں چھوائی مگر ان کا رعب اس قدر غالب تھا کہ بیاہے تیاہے ہو جانے کے باوجود ابا ان سے نظریں اونچی کر کے بات نہ کرتے تھے۔ یہی حال ہمارا بھی رہا کہ ہم نے اپنے باپ سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی اور نہ کبھی بے ضرورت ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت کی۔

میرے والد نے سولہ سترہ برس کی عمر ہی میں حیدر آباد دکن میں ملازمت کر لی تھی۔ ملازمت کا زسوم تعلقداری سے ہوا اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث اول تعلقداری تک ترقی کی۔ صوبے داری انہیں ملنے والی تھی کہ ملکی اور غیر ملکی سازشوں سے متنفر ہو کر قبل از وقت پنشن لے کر دلی چلے آئے۔ دلی میں ان کے لیے بہت سے ضروری کام رکے ہوئے تھے۔ دادا ابا کے انتقال کو پانچ چھ سال ہو چکے تھے۔ مرحوم کو تجارت میں روپیہ لگانے کا شوق تھا۔ خود ان کی زندگی میں یار لوگ لاکھوں روپیہ کھا چکے تھے تو بھلا ان کے مرنے کے بعد کیا خاک وصول ہوتا۔ ۔ ٗ ادکا کرایہ کئی ہزار روپے مہینے کا ۔ وہ سب غتر بود ہو رہا تھا۔ دادا ابا کی سب کتابیں اور ترجمہ قرآن نایا ۔ ﴿ تھا۔ غرض دادا ابا کی آنکھ بند ہوتے ہی گھر میں لٹس مچ گئی تھی ا ر جب ابا دلی پہنچے تو انہیں گھر بخی کے دل کی طرف صاف ملا۔ خود ابا کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق

آغاز جوانی ہی میں انہوں نے ''حسن معاشرت'' جیسا اصلاحی ناول لکھ ڈالا تھا جسے دادا ابا بھی دیکھ کر خوش ہوئے تھے اور علامہ راشد الخیری نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر ہمیں یہ نہ. یا جاتا کہ یہ کتاب مولوی بشیر الدین احمد نے لکھی ہے تو ہم بلاتکلف کہہ دیتے کہ ''حسن معاشرت'' مولوی نذیر احمد کی کتاب ہے، بچیوں کے لیے۔ ''حسن معاشرت'' کے بعد ابا نے دو ناول اور لکھے تھے۔ ''اقبال دلہن'' اور ''اصلاح معیشت'' ملازمت ہی کے زمانے میں سات آٹھ سو صفحے کی کتاب ''تاریخ بیجانگر'' لکھی اور اس کے بعد دو ضخیم جلدوں میں ''تاریخ بیجاپور'' لکھی۔ ان کتابوں پر نظام گورنمنٹ نے گراں قدر انعام دیا تھا۔ امریکہ کے ڈاکٹر اسٹال نے کوئی پچاس سال ادھر ایک سلسلہ کتابوں کا لکھا تھا۔ What a boy ought to know اور What a girl ought to know وغیرہ وغیرہ۔ اسی کی طرز پر ابا نے ''حرز طفلان'' ''نشاط عمر'' ''عصائے پیری'' اور ''بچیوں سے د دو باتیں'' لکھیں۔ ڈاکٹر اسٹال نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ بائبل کے حوالے دیئے تھے، ابا نے ان کتابوں میں قرآن کی آیتیں حسب موقع دیں۔ ان کی یہ سب تصانیف ز نہ قیام حیدرآباد کی ہیں۔

دلی آنے کے بعد ابا نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دادا ابا کی سب کتابیں خاص اہتمام سے چھاپیں۔ بڑا قرآن شریف اور حمائل آگرہ میں صوفی قادر علی خاں کے پریس سے چھپوا کر منگائی۔ دادا ابا کی کتابوں کے بعد اپنی سب کتابیں چھپوائیں۔ اسی دوران میں بیلی صاحب، چیف کمشنر دہلی، کی فرمائش پر تاریخ دہلی لکھنی شروع کی۔ سرسید کی آثار الصنادید میں جتنی پرانی عمارتو اور کھنڈروں کا ذکر ہے۔ ایک ایک کو خود جا کر دیکھا۔ کتنی ہی عمارتیں دست بردز نہ سے معدوم ہو چکی تھیں۔ دلی میں کتنے ہی قبرستان آباد ہو گئے تھے۔ ان کے کتبوں سے مرنے والوں کا نام نشان معلوم کیا۔ سرسید نے اپنے زمانے کے بعض اکابر دہلی کا تذکرہ آثار الصنادید میں کیا ہے۔ آثار الصنادید 1847ء میں شائع ہوئی تھی۔ تاریخ دہلی اس کے کوئی ستر سال بعد شائع ہوئی۔

مصنف نے اس میں اپنے زمانے کے بزرگوں اور اہل کمال کا تذکرہ کیا ہے۔ پرانی دلی کے تمام گلی کوچوں اور محلوں کے علاوہ نئی دلی کا پورا حال بھی اپنی تاریخ میں درج کیا ہے۔ تین موٹی موٹی جلدوں میں یہ کتاب شائع ہوئی اور اس پر حکومت سے انعام ملا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اردو میں کوئی مجموعہ شائستہ لطیفوں کا نہیں ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ سال بھر کے اندر ہی اندر چھ کتابیں تیار کر کے چھاپ دیں۔ تین حصے ''حکایات لطیفہ'' کے ہیں اور تین حصے ''لطائف عجیبہ'' کے۔

میرے والد بڑے محنتی آدمی تھے گرمیوں میں صبح چھ بجے ناشتہ کر کے لکھنے پڑھنے کے کام پر جم جاتے۔ میز کرسی نہیں فرش پر بیٹھتے تھے۔ صدر دالان میں چاندنی کا فرش، پیچھے گاؤ تکیہ، آگے لمبی سی نیچی میز۔ میز پر کاغذوں کے انبار، دونوں پہلوؤں میں کتابوں کے ڈھیر۔ بائیں طرف بڑے سے تھال میں اونچا سا حقہ جس کی سنک ان کی گود میں پڑی رہتی۔ ایک لڑکا صرف حقے پر نوکر تھا۔ اس کا یہ کام تھا کہ صبح سے رات گئے تک حقے تازے کرتا رہے اور چلمیں بھرتا رہے۔ بیسیوں قسم کے حقے گھر میں تھے، لکھنو کے ہر دم تاز ا رگڑگڑی سے لے کر نصف قد آدم تک کے حقے۔ ایک حقہ چاندی کا بھی تھا جو شادی بیاہوں کے موقع پر نکالا جاتا تھا۔ حقہ کیا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ دولہا سہرا بدھی پہنے کھڑا ہے۔ خمیرا اور تمبا کو لکھنؤ سے آتا تھا اور اس کی خوشبو سے سارا گھر مہک جاتا تھا۔ گرمیوں میں دالان کے دروں پر خس کی ٹٹیاں لگ جاتیں۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد انہیں تر کیا جاتا۔ سقفی پنکھا فرائے بھرتا۔ اس پرسکون اور ٹھنڈی فضا میں ابا اپنے کام میں کھو جاتے۔ حقے بھی خس ہی کے استعمال کیے جاتے۔ لڑکا انہیں تازہ کرتا رہتا اور چلمیں بدلتا رہتا۔ ابا کو اپنے کام میں اس قدر انہماک ہوتا کہ انہیں دین دنیا کی کچھ خبر نہ رہتی۔ بارہ ڑھے بارہ بجے بی مغلانی ہلکے سے کھانس کھنکار کے دالان میں داخل ہوتیں اور کہتیں "سرکار کھانا تیار ہے۔" ابا چونک کر ہاتھ سے قلم رکھ دیتے۔ اگلے دالان میں فرش پر دسترخوان بچھ جاتا۔ اتنے میں کھانا اور ہم سب قرینے سے ہو بیٹھتے۔ ایک لڑکا آفتابہ اور سلفچی لے کر پہنچ جاتا اور ابا ہاتھ دھو، کلی کر دسترخوان پر آ جاتے۔ ہم سب اپنے باپ سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لیے خاموش رہتے۔ کھانے کے دوران میں ابا کو بھی اس خاموشی کا احساس ہو مزے مزے کی باتیں چھیڑ دیتے۔ مثلاً ہمارے ہاں چند دسترخوان ایسے تھے جن کے حاشیے پر نیلے اور لال شیر چھپے ہوئے تھے، منہ پھٹا ہوا، دم اٹھی ہوئی، جیسے ابھی حملہ کر دیں گے۔ ہم چونکہ بہت دنوں سے انہیں دیکھتے چلے آ رہے تھے کبھی ہم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ان شیروں میں کیا مصلحت ہے۔ ایک دن جب ان میں سے ایک دسترخوان بچھا تو ابا ہی نے پوچھا کہ "بتاؤ اس پر یہ شیر کیوں چھپے ہوئے ہیں؟" ہم کیا بتاتے؟ بولے "معلوم نہیں" ابا نے کہا۔ "حیدر آباد میں ایک چھیپی کو یہ دسترخوان دیئے تھے کہ ان پر شعر چھاپ لاؤ وہ کمبخت یہ شیر چھاپ لایا۔ جب اس سے کہا کہ یہ کیا کیا تو بولا "سرکار ہی تو بولے تھے کہ اس پر شیراں چھاپ کو لاؤ۔" اس انکشاف پر ہم سب ہنستے اور ابا بھی ہمارے ساتھ ہنسنے لگتے۔ ایسی خوش مزاجی کی باتیں ابا اکثر کرتے تھے مگر نہ جانے کیوں ہم بچوں کا تو ان سے دم ہی نکلتا رہا۔

بڑے خوش مذاق آدمی تھے۔ کھائے من بھاتا۔ پہنے جگ بھاتا۔ اچھے سے اچھے رچی ملازم

رکھتے اور عمدہ سے عمدہ کھانے پکواتے۔ لباس کے بھی بہت شوقین تھے۔ دیسی اور ولایتی سبھی قسم کے کپڑے تھے اور اتنے زیادہ کہ ان کے پہننے کی باری بھی نہیں آتی تھی۔ ایک زمانے میں انگرکھا بھی پہنا کرتے تھے۔ رزشی جسم تھا اس لیے ان پر پھبتا بھی خوب تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سیکڑوں ہی جوڑے جوتے اور تیوں کے ان کے پاس تھے۔ لونگ بوٹس سے لے کر سلیم شاہی تک کوئی قسم جوتی کی نہیں بچی تھی۔ یہی حال ٹوپیوں کا تھا کہ سولا ہیٹ سے دو پلی تک سبھی موجود۔ چھڑیوں کے کئی گھٹے تھے جن میں سونٹے بھی تھے اور قچیاں بھی۔ سواری کے لیے گھوڑے ہمیشہ ان کے پاس رہے۔ دلی آنے کے بعد بھی دو بگھیاں گھر پر رہیں۔ موٹر انہوں نے کبھی نہیں رکھی۔ کتابیں ان کے پاس کئی ہزار تھیں۔ دو کمروں میں یہ کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ پنشن لینے کے بعد ان کا اوڑھنا بچھانا ہی کتابیں ہو گئی تھیں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر آرام کرتے اور عصر کے بعد پھر لکھنے بیٹھ جاتے تو عشاء کے وقت اٹھتے۔ رات کے کھانے کے بعد لیٹ کر مطالعہ کرتے۔ گیارہ سے پہلے نہیں سوتے تھے اور صبح اذانوں کے وقت اٹھتے اور اپنے کمرے ہی میں ورزش کر لیتے تھے، خصوصاً سینڈو کے ڈمبل، ساٹھ سال کی عمر میں چالیس سال کے معلوم ہوتے تھے۔

حیدر آباد میں جب میری والدہ کا انتقال ہوا تو میری عمر چھ برس کی تھی اور بڑے بھائی نو برس کے تھے۔ سب سے چھوٹی بہن چند روز کی تھی، اسی کے جاپے میں اماں کا انتقال ہوا ۔ ابا نے ہم چار بھائیوں اور دو بہنوں کو اس اہتمام سے پالا کہ ہمیں اپنی ماں کی کمی شاید ہی کبھی محسوس ہوئی ہو۔ نوکر چاکر اور خادماؤں کے علاوہ ہم پر یورپین گورنسیں رکھیں، نرسیں اور آیائیں رکھیں اور ہمیں اعلیٰ درجے کے ان کونونٹ سکولوں میں پڑھوایا جن میں دیسی بچوں کا داخلہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر ابا حاکم ضلع تھے اس لیے ان کی بات کیسے ٹلتی؟ پھر جب ہم ذرا بڑے ہو گئے تو ہم تین بھائیوں کو علی گڑھ میں خود لے جا کر داخل کیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کو ہمارا نگراں مقرر کیا۔ بورڈنگ میں بھی ایک ملازم اور ایک پرائیویٹ ٹیوٹر ہمارے لیے رکھا۔ ڈھائی تین سال کے بعد جب تحریک ترک موالات چلی تو ہمیں دلی بلا لیا۔ شام کو ہم سب کو دو گھنٹے انگریزی اور فارسی خود پڑھاتے اور حساب اور دوسرے مضامین پڑھانے کے لیے ٹیوٹر مقرر کیے۔ ابا نے ہماری تعلیم و تربیت کے لیے کبھی روپے کا منہ نہیں کیا۔ دل کھول کر خرچ کرتے پیسے کی کمی بھی نہیں تھی۔ علاوہ کئی لاکھ کے وثیقے کے تین چار ہزار روپے مہینے کی یافت تھی۔ سلیقے مند آدمی تھے، کسی عیب میں نہیں تھے۔ سستا سماں، ایک پیسے کے چار سودے آتے تھے۔ دلی کے نام نہاد نوابوں سے زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی گزارتے۔ سرکار میں بھی بات بنی ہوئی تھی۔ خطاب اور آنریری مجسٹریٹی کی کئی دفعہ پیشکش ہوئی مگر یہ کہہ کر رد کر دی کہ اس سے

میرے علمی مشاغل میں فرق آتا ہے۔ خان بہادری سے انہیں نفرت تھی۔ شمس العلماء کا خطاب تجویز ہو رہا تھا کہ پیامِ اجل آ گیا۔

ابا بڑے مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ ان کی ابتدائی تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ڈاڑھی کبھی نہیں منڈوائی۔ بڑی خوبصورت پھریری ڈاڑھی تھی ابا کی، مگر و انگشت سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ اتنی ہی ڈاڑھی دادا ابا کی بھی تھی۔ مگر چھدری۔ ابا کا خط بھرواں ـ اس زمانے میں یہ ایڈ رڈ فیشن کی ڈاڑھی کہلاتی تھی۔ بعد میں جارج پنجم کی ڈاڑھی بھی اسی وضع کی رہی۔ نماز پابندی وقت کے ساتھ پنج وقتہ پڑھتے تھے۔ رمضان شریف میں ترابیاں (تراویح) بھی پڑھنے جاتے تھے۔ قرآن شریف روانی اور خوش الحانی سے پڑھتے اور ماہ صیام میں ہر تیسرے دن ایک قرآن ختم کرتے۔ ہم سب کو بھی نماز ر زے کی تاکید تھی۔ سحری را افطار میں سب شریک ہوتے۔ محلے کی مسجد میں افطاری ضرور بھجوائی جاتی۔ میلاد اور وعظ بھی ہوتا تھا، خصوصاً مولوی دلہن کا۔ یہ مولوی دلہن بھی ایک خاص وضع کے آدمی تھے۔ وارثیوں کی طرح ایک گیروا چادر لپیٹے رہتے۔ زلفوں کے چھلے دونوں شانوں پر پڑے ہوئے، اجلا رنگ، کشادہ پیشانی، لمبوترا چہرہ، کڑبڑی ڈاڑھی، لبیں ترشی ہوئی۔ سنہری فریم کی عینک جس میں سے سرمہ لگی آنکھیں چمکتی رہتیں۔ پان کھاتے اور مسی لگاتے۔ عطر حنا میں بسے رہتے۔ وعظ لچھے دار زبان میں کہتے اور نعت و منقبت لہک کر سناتے۔ جی لگتا تھا ان کے وعظ میں۔ ایک آدھ مرتبہ مولوی احمد سعید کا وعظ بھی سنا۔ ان کی تقریر عالمانہ تھی، ا ر جب ایک دم سے پٹری بدل کر دلی کی ٹکسالی ز بولنے پر آتے تو سننے والوں میں ہنسی پڑ جاتی ر زِ محشر کا نقشہ مولوی صاحب پیش کر رہے ہیں کہ "سوا نیزے پر آفتاب ہوگا، آنکھیں بجائے چہرے کے سروں پر لگی ہوں گی۔ گرمی کا یہ حال ہوگا کہ گنہگار ٹخنوں ٹخنوں، گھٹنوں گھٹنوں، کمر کمر اور گردن گردن تک پسینے میں ڈوبے ہوں گے۔ جو اور زیادہ گنہگار ہوں گے وہ پسینے میں غوطے کھا رہے ہوں گے۔ مگر جو اللہ کے نیک بندے ہوں گے و در کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے چائے بسکٹ اڑا رہے ہوں گے۔"

زکوٰۃ بھی ابا بڑی پابندی سے نکالتے تھے۔ غریب اور مسکین رشتہ دار ا ر کنبہ داروں کے ماہانے مقرر تھے۔ بیواؤں اور یتیموں کا حق ان کے بعد آتا تھا۔ ان کے بعد کارِ خیر کا نمبر تھا۔ جاڑوں میں لحاف بنوا کر تقسیم کرتے اور گرمیوں میں لٹھے ململ کے جوڑے۔ حج کو جانے کا ارادہ ہی کرتے رہے۔ ہم سب کی شادیاں کر چکے تھے۔ صرف میری سب سے چھوٹی بہن رہ گئی تھی۔ اس کی شادی کے بعد جاتے، مگر اس سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

دادا ابا خاصے کٹر مولوی تھے، وہ دین کے آگے دنیا کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ابا دین اور دنیا دونوں رکھتے تھے۔ تھیٹر اور سینما دیکھتے اور ہمیں بھی دکھاتے۔ ہماری شادیوں میں برات کے ساتھ بینڈ باجہ تو نہیں بجا لیکن دو دو تین تین دن تک مشہور طوائفوں کے ناچ گانے اور ۔ نڈوں کے مجرے اور نقالوں کی نقلیں ہوتی تھیں۔ یہ محفلیں مخصوص ہوتی تھیں اور ان میں صرف ان شرفا کو مدعو کیا جاتا جنہیں اس فن کا ذو ہوتا۔ ان محفلوں میں بیلیں نہیں دی جاتی تھیں اور نہ کوئی اور بیہودگی روا رکھی جاتی۔

اس پر ایک ناگوار قصہ یاد آیا۔ ہمارے ایک دور پرے کے عزیز جو بڑے کٹر اہل حدیث ہیں ابا کے پاس ہمیشہ آتے رہے مگر ابا کے جنازے میں نہیں دکھائی دیئے۔ بعد میں انہوں نے بڑے بھائی سے کہا کہ ''بھائی بشیر رنڈی کا ناچ دیکھتے تھے۔ اس لیے میں ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوا۔'' بھائی نے کہا۔ ''مگر ہم تو آپ کے جنازے میں شریک ہوں گے اور آپ کو کندھا بھی دیں گے۔'' بہت ناراض ہوئے اور پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔

ابا ساری عمر بڑے بڑے عہدوں پر رہے اور چوں کہ ضلع کے حاکم ہوتے تھے اس لیے ہر قسم کے مقدموں کی سماعت کر کے فیصلے لکھتے تھے مگر بڑے رحم دل اور خاصے بھولے آدمی تھے۔ پھانسی کا حکم جہاں تک ممکن ہوتا نہیں سناتے تھے۔ حیدر آباد میں پھانسی نہیں دی جاتی تھی بلکہ ''گردن ماری'' جاتی تھی۔ یعنی مشکیں کسنے اور زانو کرنے کے بعد جلاد بھٹا سا سر اڑا دیتا تھا۔ اس وقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی موجود رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے ابا عموماً عمر قید کی سزا دیا کرتے تھے۔ ان کی اس نرم دلی سے رعایا تو بہت خوش رہتی مگر حکومت کی ''بری کتابوں'' میں ان کا نام چڑھتا رہتا۔ مگر ابا نے کبھی اس کی پروا نہیں کی اور جب ان کی بہت مخالفت ہوگئی تو نوکری چھوڑ چھاڑ کر دلی چلے آئے۔

ابا کی کتابیں لکھنے کے لیے کئی کاتب ہمارے مردانے گھر ہی میں بیٹھ کر کتابت کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک خوش نویس غیاث الدین بھی تھا جو خوش خط تو بہت تھا مگر بڑا غیر ذمہ دار۔ اجرت ملتے ہی کئی کئی دن کے لیے غائب ہو جاتا۔ ا. اس کے تساہل کو اس کی خوشخطی کی وجہ سے ٹال جاتے۔ مگر حد ہوتی ہے برداشت کی بھی۔ غیاث بہانے بنا کر رقم پیشگی بھی لے جاتا اور کام پر بھی نہ آتا۔ ا ہوتے تو مسمی سی صورت بنا کر کبھی اپنے باپ کے مرنے کی خبر سنا دیتا اور کبھی اپنی ماں کے فوت ہونے کی۔ غرض رفتہ رفتہ اس نے اپنے تمام بڑوں کو مار ۔ ابا کو جب غصہ آتا تو بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ ایک چیخ ان کی زمین پر اور ایک آسما پر ہوتی۔ ہتھ چھٹ بھی تھے۔ دو چار تھپڑوں ہی میں آدمی کا بھرکس نکل جاتا۔ مگر

غیاث اپنی چالاکیوں سے بچتا رہا۔ ایک دن غائب ہو کر حاضر ہوا تو ابا نے ڈانٹا۔ سوکھا سا منہ بنا کر بولا۔ ''گھر والی کا جاپا بگڑ گیا ہے۔ اسے ہسپتال لے کر گیا تھا۔'' ابا نے کہا۔'' تو کام کرو'' مگر غیاث سر جھکائے وہیں کھڑا رہا۔ ابا نے کہا۔''جاتے کیوں نہیں؟'' ''کچھ پیسے چاہئیں خرچہ کے لیے۔'' ابا نے کہا۔'' ' اشتیاق (منیجر) سے لے لو۔ وہاں سے خوش خوش آ۔ اور اشتیاق صاحب سے دس بیس روپے لے کر پھر غائب ہو گیا۔ جب وہ پیسے اڑا چکا تو پھر آ گیا۔ کاتبوں نے کہا۔''ڈپٹی صاحب صبح سے کئی دفعہ تجھے پوچھ چکے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کہ اسے آتے ہی میرے پاس بھیجنا۔ آج تیری خیر نہیں ہے۔ سر سے توا باندھ کر جائیو۔ سارے کٹم کو مار چکا۔ پیشگیاں الگ مارتا ہے۔ آج بیٹا و ر پڑے گی کہ ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔'' مگر میاں غیاث نہایت اطمینان سے ابا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ابا جھلائے ہوئے بیٹھے تھے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو دیکھا کہ غیاث سر اور ' ڑھی کے بال پریشان کیے میلے چیکٹ کپڑے پہنے کھڑے ہوئے ہیں اور رخسار آنسوؤں سے تر ہیں۔ اس سے پہلے کہ ابا کچھ کہیں خود انہوں نے رو کر کہا۔''مر گئی۔'' ابا کا چہرہ اس وقت دیکھنے کے لائق تھا۔ یا ' رے غصے کے ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا یا ایک دم سے ست گیا اور گھبرا کر بولے۔'' ۔ وَ، اشتیاق سے کچھ لے کر فوراً گھر جاؤ۔'' یاد نہیں کون پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے بولے۔''اے ہے، بیچارے کی بیوی مر گئی۔'' غیاث وہاں سے الٹے قدموں لوٹے اور ' ڑھی سے نکلتے ہی ٹھٹھے لگاتے اشتیاق صاحب کے پاس پہنچے کہ ''لائیے روپے دلوائیے، ڈپٹی صاحب نے کہہ دیا ہے۔'' سب نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ پوچھا ''ابے کیا منتر مارا آج؟ تیری تو آج خبر ہی آنے والی تھی؟'' غیاث نے ہنس کر لطیفہ سنایا۔ چشتی صاحب نے کہا۔''ہا کمبخت، منحوس، تو نے جورو کو جیتے جی مار ڈالا۔'' بولے۔''جی حضور، ورنہ آج میں مارا جاتا۔''

ابا نے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی۔''تمثال الامثال'' اس میں محاورے ضرب الامثال اور کہاوتیں جمع کرنی شروع کی تھیں۔ اپنے سب جاننے والوں اور ' ندان کی پڑھی لکھی عورتوں میں سادی کاپیاں تقسیم کر دی تھیں کہ جو محاورہ ۔ دآئے اس میں لکھ لیں جتنی کتابیں مل سکیں خرید یں یا مستعار لیں۔ یہ کام اتنا پھیلا کر پرچیاں اور کاغذ کے پلندے دیکھ کر ہی ہمارا دم نکلتا تھا۔ کوئی مددگار انہوں نے اپنا مقرر نہیں کیا۔ خود ہی سارا کام کرتے۔ تمام شاعروں کے دیوان اور ادیبوں کی کتابیں خود ہی چھانتے رہتے۔ فرہنگ آصفیہ اور ' رالالغات تو کبھی کی مسودوں میں کھپ چکی تھیں۔ سند کے لیے اشعار بھی چھانٹے جا چکے تھے۔ مگر یہ کتاب تو پھیل کر زبان کی انسائیکلو پیڈیا بنتی جا رہی تھی۔ پہیلیاں کہہ مکرنیاں ، دو سخنے، سہ سخنے، انمل،

ڈھکوسلے اور خدا جانے کیا کیا اس میں شامل کیے جانے لگے۔ شاید ابا بھی اس سے گھبرا گئے تھے، اس لیے انہوں نے جی بہلانے کے لیے شاعری شروع کر دی۔ مگر یہ شاعری تو ان کے گلے کا ہار ہو گئی۔ ایک ایک دن میں دس دس بیس بیس غزلیں ہونے لگیں، پھر انہیں خیال آیا کہ لاؤ کسی استاد سے مشورہ بھی کر لیا جائے۔ پہلے استاد بیخود سے رجوع کیا، تھوڑے دن تو نبھی، اس کے بعد ان سے چخ گئی۔ استاد بڑے منہ پھٹ اور بدلحاظ آدمی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ شاگرد تو اصلاح پر حجت کرتا ہے، صاف جواب دے دیا کہ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ استاد بیخود کے ٹرے پن سے بیزار ہو کر نواب سائل سے ناتہ جوڑا۔ ان سے دوستی پہلے بھی تھی۔ وہاں بھی اصلاح پر اختلاف ہوا، نواب کہتے کہ ''اس مصرعہ کو یوں کر لو'' ا کہتے ''نہیں جی، میرا ہی مصرعہ ٹھیک ہے۔'' نواب سائل مدمغ آدمی تھے مگر شائستہ۔ انہوں نے کچھ عذر معذرت کر کے اپنے استاد بھائی نوح ناروی سے اصلاح لینے کا مشورہ دیا۔ نوح صاحب سے میزان پٹ گئی۔ وہ مرنجاں مرنج قسم کے آدمی اور بڑے پرانے تجربہ کار، دو چار خطوں میں جان گئے کہ یہ شاگرد اصلاح سے چڑتا ہے۔ یہاں سے غزلوں کا پلندا نارہ جاتا اور دو چار مصرعوں کی تبدیلی کے بعد جوں کا تو جاتا۔ غرض سال ڈیڑھ سال میں مُردّف دیوان تیار ہو گیا ا ر ''دیوان بشیر'' کے نام سے شائع بھی ہو گیا۔

اسی عرصے میں خیال آیا کہ لاؤ لگے ہاتھوں بادشاہوں کے فرمان ہی جمع کر لیں۔ خبر نہیں کہاں کہاں سے فرمان، ان کی تصویریں اور ان کی نقلیں منگوائی گئیں۔ انہیں مرتب کر کے ان کے ترجے اور حواشی لکھے۔ ایک سال میں خاصی موٹی کتاب ''فرامین سلاطین'' شائع ہو گئی۔ پھر لڑکیوں کے لیے ''انشائے بشیر'' لکھی۔ اس سے پہلے میری بہن کے جہیز میں دینے کے لیے دو حصوں میں ''لخت جگر'' لکھی تھی۔ غرض تابڑ توڑ اتنی کتابیں لکھیں کہ اس زمانے میں سوائے مولوی عبدالحلیم شرر کے کسی اور نے اتنی کتابیں نہ لکھی ہوں گی۔

شرر کا بھی ایک واقعہ یاد آ گیا۔ انہوں نے پردہ کے خلاف ایک ناول ''بدر النساء کی مصیبت'' لکھا تھا۔ ابا کو انہوں نے اس کی ایک کاپی بھیجی اور خط لکھا کہ ''مولوی صاحب'' آپ بھی آج کل کے پردے کے خلاف لکھیے اور میری تائید کیجیے۔'' ہر چند کہ ابا کسی قدر آزاد خیال مولوی تھے اور رتوں کے حقوق اور عورتوں کی حمایت میں بہت کچھ لکھتے رہتے تھے مگر اتنے آزاد خیال بھی نہیں تھے کہ مذہب کے اوا نواہی کو بالائے طاق رکھ دیتے۔ ہمارے گھر میں سختی سے پردہ کیا جاتا تھا۔ گھر کی عورتیں کہیں ملنے ملانے یا شادی غمی میں جاتیں تو گھر کی بند بگھی میں یا ڈولی میں اور ڈولی کے پردے پر بھی ایک چادر ڈال دی جاتی۔

بارہ برس سے زیادہ عمر کا لڑکا زنانہ گھر میں ملازم نہیں رکھا جاتا تھا۔ شرر کا خط جب آ ـ ابا خوش مذاقی کے موڈ میں تھے۔ جواب میں لکھا کہ ''ایسا کیجیے کہ پہلے آپ اپنی بیوی اور بچوں کو لا کر میرے سامنے کیجیے پھر میں آپ کی تائید کروں گا۔ کار خیر گھر سے شروع ہونا چاہیے۔'' خبر نہیں اس کے بعد کیا گزری۔ شرر تو آئے نہیں۔

شاعری اور دوسری کتابوں میں الجھ جانے سے یہ ہوا کہ ''تمثال الامثال'' رہ گئی۔ دراصل یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا تھا بھی نہیں۔ اس کے لیے ایک معقول ادارہ کی ضرورت تھی۔ ہاں اگر ابا چار پانچ سال اور جی جاتے تو شاید خود ہی ختم کر لیتے۔

ہم نے تو اس پشتارے کو ایک مضبوط کپڑے میں باندھ کر مچان پر ڈال د ـ ۔ ہمارے پاکستان چلے آنے کے بعد خدا جانے اس کا کیا حشر ہوا۔ آں دفتر را گاؤ ' ردو گاؤ را قصاب برد۔

1926ء میں جاڑوں کے دن تھے۔ ایک صبح جو اٹھے تو انہیں اپ دایاں ہاتھ اور پ ؤں سن محسوس ہوا۔ فرش خانہ والے حکیم سراج الدین کا ہمارے ہاں علاج ہوتا تھا۔ حکیم جی کو بلوایا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ فالج کا اثر ہے۔ بہت توجہ سے حکیم جی نے علاج کیا۔ منج دیئے، ہفت مطبوخ کے جلاب دیئے۔ پھر یدیں پلائیں، مگر اثر کم نہ، ا۔ ابا کہتے تھے کہ موت کا پیام آ گیا، اس کا کوئی غم نہیں ہے۔ مرنا برحق ہے، غم اس کا ہے کہ میرا پڑھنا لکھنا سب بند ہو گیا۔ کتنے کام ادھورے رہ گئے۔ حکیم سراج الدین کے بعد حکیم بھورے میاں اور حکیم ظفر خاں کا علاج بھی کیا گیا، حالت گرتی ہی گئی۔ بنارس سے ایک وید کو بھی بلایا تھا۔ اس کے علاج سے بھی افاقہ نہ ہوا۔ دو سال تک یہی کیفیت رہی۔ اللہ کا اتنا کرم ضرور رہا کہ چل پھر لیتے اور اپنے چھوٹے موٹے کام خود کر لیتے۔ آخر آخر میں ڈاکٹر انصاری کو ہم نے بلوایا۔ اچھے طبیب اور اچھے آدمی تھے۔ ڈاکٹر انصاری۔ ابا کو دیکھ کر رنجیدہ ہوئے۔ ابا سے تو انہوں نے یہی کہا کہ آپ اچھے ہو جائیں گے مگر باہر نکل کر ہم سے کہا کہ امید بچنے کی نہیں ہے۔ بھائی نے ان کی فیس پیش کی تو قبول نہیں کی اور بولے ''میرے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ بڑے ڈپٹی صاحب کا علاج بھی میں نے کیا ا ر چھوٹے ڈپٹی صاحب کا بھی۔'' ابا کو جب تک ہوش رہا پلنگ پر نہیں پڑے۔ نماز پابندی سے پڑھتے رہے۔ آخر کے دو تین دن ایسے گزرے کہ بے سدھ پڑے رہتے۔ کبھی ہوشیار ہوتے تو بولنے کی کوشش کرتے مگر زبان نہیں اٹھتی تھی۔ غذا بالکل بند ہو گئی تھی۔ تیمار دار د دعائیں مانگنے لگے تھے کہ یا اللہ ان کی مشکل آسان کر اور ایک دن را - کے دو بجے ہمیں بتایا گیا کہ ابا جا رہے ہیں۔ ہم سب د ڑ کر ان کے پاس پہنچے۔ سسکیاں آ رہی تھیں۔ عجب

بے کسی کا وقت تھا۔ سب کھڑے تکتے رہے۔ ماموں جان یٰسین سنا رہے تھے۔ دو تین ہچکیاں آئیں اور گردن کا منکا ڈھلک گیا اور دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن